بسم اللہ الرحمن الرحیم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ:

69: اللہ تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی، اور مومن کا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دیدار کے ثبوت کا بیان

العقیدۃ الواسطیۃ لشیخ الاسلام الامام ابوالعباس احمد ابن تیمیہ رحمہ اللہ، شرح فضیلۃ الشیخ العلامہ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ۔ اور ہم پہنچے تھے پندرہویں (15) حدیث پر، اور ہم بات کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے تعلق سے جو احادیث ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ثبوت ملتا ہے اُن کا ذکر کر رہے ہیں اور اب اُن احادیث پر پہنچے ہیں جن میں ایسی صفات کا ذکر ہے جن کے ثبوت قرآن مجید میں بھی ملتے ہیں۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ شرح میں فرماتے ہیں: "الحديث الخامس عشر: في إثبات قرب الله تعالىٰ" (پندرہویں حدیث اللہ تعالیٰ کے قرب اور نزدیکی کے ثبوت کا بیان) "وهو قوله صلى الله عليه وسلم: لَمَّا رفع الصحابة أصواتهم بالذكر: "أيُّها النَّاسُ! أرْبَعُوا عَلَى أنْفُسِكُمْ، فَإنكُمْ لا تَدْعُونَ أصَمَّ وَلا غائِبًا؛ إنَّمَا تَدْعونَ سَميعًا بَصيرًا، إنَّ الذي تَدْعونَهُ أقْرَبُ إلى أحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ راحِلَتِهِ": متفق علیہ۔

شرح میں شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کسی سفر میں ہوتے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوتے وہ جب کسی اونچائی پر چڑھتے تو تکبیر پڑھتے، اور جب کسی جگہ سے نیچے اُترتے یا اونچائی سے نیچے اُترتے تو تسبیح پڑھتے۔

جیسا کہ آپ سب ساتھی جانتے ہیں یہ سنت ہے کہ آپ جب کسی اونچی جگہ پر جائیں تو تکبیر پڑھیں اور جب آپ کسی پست جگہ پر نیچے اُتریں یا اونچائی سے نیچے اُتریں تو پھر آپ تسبیح پڑھتے ہیں سبحان اللہ کہتے ہیں۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: اس کی حکمت یہ ہے کہ جب انسان بلندی پر جاتا ہے تو اس کے نفس میں بڑا پن محسوس ہوتا ہے اُسے کہ وہ دوسروں سے بلند ہے (یعنی خود پسندی کا تاکہ شکار نہ ہو) اس لیے وہ تکبیر پڑھتا ہے، مناسب ہے کہ وہ کہے

"اللہ اکبر"، اپنے نفس کو اپنے آپ کو یہ یاد دہانی دیتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی کبریائی ہے اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، اور جب وہ کسی ایسی جگہ پر جاتا ہے یا نیچی کسی جگہ پر جاتا ہے یا اونچائی سے نیچے اُترتا ہے تو اس میں پستی محسوس کرتا ہے تو اس لیے "سبحان اللہ" کہتا ہے اپنے آپ کو یہ یاد کراتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے اور ہر پستی سے پاک ہے۔

تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہ طریقہ تھا لیکن جب یہ ذکر کرتے تو بہت ہی بلند آواز میں کرتے اونچی آواز میں کرتے؛ تو اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے (یعنی اُن کی اس بلند آواز سے ذکر کو سننے کے بعد): "أَيُّهَا النَّاسُ!" (اے لوگو!) "ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ" (یعنی اپنے نفس پر رحم کرو (نرمی کرو)) "فَإِنَّكُمْ لا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلا غَائِبًا" (یعنی آپ جسے پکار رہے ہو بے شک وہ نہ بہرا ہے اور نہ ہی غائب ہے) "إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا" (جسے تم پکار رہے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ نہ تو بہرا ہے جو سنتا نہیں ہے اور نہ ہی غائب ہے جو دیکھتا نہیں ہے) بلکہ وہ جو کچھ بھی تم کہتے ہو خوب سننے والا ہے "سَمِيعًا" اور جو تم کرتے ہو وہ خوب دیکھنے والا ہے بصیر ہے "سَمِيعًا بَصِيرًا")۔

پھر اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ الذي تَدْعونَهُ أَقْرَبُ إِلى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ راحِلَتِهِ" (بے شک جسے تم پکارتے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ) وہ تم میں کسی شخص کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے)۔

اور عام طور پر سواری سے مراد اونٹ ہے اور جب کوئی اونٹ پر سواری کرتا ہے تو اونٹ کی گردن اُس کے بالکل قریب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس اونٹ سوار کی گردن سے بھی اس شخص کے زیادہ قریب ہے اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ جو ہے وہ آسمانوں پر ہے اپنے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہے۔

اور اس میں کوئی تضاد یا منافات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب بھی ہے اور بلندیوں پر بھی ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جو دور ہو کر بھی قریب ہوتی ہیں؛ یہ مخلوق کے لیے ہے تو پھر خالق کیا کہنا؟! اللہ عزَّوجلَّ ربّ کریم سبحانہ وتعالیٰ قریب ہے اس کے باوجود کہ وہ بلندیوں پر بھی ہے، اور اللہ تعالیٰ اتنا قریب ہے ہم میں سے کسی شخص کے، جیسا کہ کوئی شخص اپنی سواری کی گردن کے قریب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اس حدیث میں چند فوائد اور پیغامات ہیں:

1-سب سے پہلے شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ): صفات سلبیۃ کا ذکر ہے اور ہمیں ثبوت ملتا ہے؛ اور صفات سلبیۃ اُن صفات کو کہتے ہیں جن کی نفی کی گئی ہے اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ اس حدیث میں اُصم اور غائب کی نفی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ بہرا نہیں ہے اور نہ ہی غائب ہے۔

اور صفات سلبیۃ یا منفیۃ ان صفات کو کہتے ہیں یا اس لیے ان کو ثابت کیا جاتا ہے وجہ کیا ہوتی ہے حکمت کیا ہے؟ ''لإثبات كمال الضد'': یہ قاعدہ ہوتا ہے تاکہ جو اس کی ضد کی صفت ہے (اس کے Opposite جو ہے) اس کے کمال کو ثابت کرنا؛ کہ جب بہرا نہیں ہے تو سمیع ہے۔

سمیع صیغ المبالغہ ہے "سمع"؛ اور صیغ المبالغہ کیوں بیان ہوتا ہے؟ یعنی بے حد اس صفت کو پانے والا۔

صیغ المبالغہ: مبالغہ کہتے ہیں بہت ہی زیادہ، یا حد سے تجاوز کرنا۔

اور غائب کی نفی کی گئی ہے: ''لكمال بصره وعلمه وقرب''؛ (سبحان اللہ): وہ خوب دیکھتا ہے، خوب جانتا ہے اور وہ بہت قریب بھی ہے اپنے بندوں کے، اپنی مخلوق کے۔

ایک لفظ کی نفی میں یہ تین عظیم صفات کے کمال کا ثبوت ملتا ہے۔

کوئی اور مثال دے گا مجھے صفت سلبیۃ کی؟ ﴿لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٞ وَلَا نَوۡمٞ﴾(البقرة:255): نفی کی گئی ہے اونگھ کی اور نیند کی۔

"لكمال قيومته وحياته": اللہ تعالیٰ کی قیومیت اور حیات کے کمال کی صفت "الْحَيُّ الْقَيُّومُ" پہلے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اس آیت الکرسی میں:

﴿ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلۡحَيُّ ٱلۡقَيُّومُ﴾ (کتنے حی اور قیوم ہیں؟! سبحان اللہ)؛ ﴿لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٞ وَلَا نَوۡمٞ﴾۔

جسے اونگھ آتی ہے وہ کمال کا قیوم نہیں ہو سکتا اور جسے نیند آتی ہو وہ کمال کا زندہ نہیں ہو سکتا کیونکہ نیند کو بھی موت ہی کہا گیا ہے (دیکھیں سبحان اللہ)، جبکہ پہلے ثابت ہو چکا ہے صفت قیومیت اور اور الحیاۃ (زندگی) لیکن کمال کی حد تک یعنی کمال کو بیان کرنا ہے تو اس کے ساتھ جو صفت سلبیۃ ہے یا منفیۃ ہے اس کو بھی ذکر کیا ہے (سبحان اللہ)۔

2- شیخ صاحب فرماتے ہیں: اس میں یہ بھی ثبوت ملتا ہے یا یہ بھی پیغام ہمیں ملتا ہے اس حدیث میں کہ انسان کو یہ چاہیے (مسلمان کو یہ چاہیے) کہ وہ اپنے آپ کو عبادت کرتے ہوئے مشقت میں نہ ڈالے نرمی سے کام لے، اپنے اوپر رحم کرے

کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب انسان آپ کو تھکا دیتا ہے عبادت میں تو پھر وہ ملالت کا شکار ہو جاتا ہے اور جسم پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کہ عمل میں سے اپنے آپ کو حد سے زیادہ تکلیف مت دو (یعنی اتنا عمل کرو جتنی تمہارے اندر طاقت ہے) بے شک اللہ تعالیٰ کو ملالت نہیں ہوتی جب تک کہ تمہیں ملالت نہ ہو"۔ اور یہ متفق علیہ حدیث ہے اور اس میں کتنا پیارا پیغام ہے!

آپ یہ دیکھیں کہ عبادت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے عبادت کی دو قسمیں ہیں، فرض بھی ہے نفل بھی ہے (فرائض بھی ہیں اور نوافل بھی ہیں) ہم سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ کیسے کیا گیا ہے؟ فرائض تو ہم نے ادا کرنے ہیں۔ کیسے کرنے ہیں؟

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:16)۔

نماز میں قیام رکن ہے قیام کے بغیر آپ کی نماز نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی عذر شرعی ہو آپ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو اس کی اجازت ہے کہ آپ بیٹھ کر پڑھ لیں؛ آپ بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے کمر میں شدید درد ہے یا کوئی اور وجہ ہے تو آپ لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں (سبحان اللہ)۔

کیونکہ انسان کو جو ہیئت ہوتی ہے کنڈیشن ہوتی ہے یا تو وہ کھڑا ہوتا ہے، یا بیٹھا ہوتا ہے، یا لیٹا ہوتا ہے۔ کوئی اور کنڈیشن ہے؟ کوئی اور آپشن ہے کوئی؟ یعنی لیٹنے کے علاوہ انسان اور کیا کر سکتا ہے؟!

تو نماز ساقط نہیں ہوتی، فرائض ساقط نہیں ہوتے یاد رکھیں لیکن یہ آسانی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

الرخص الشرعیۃ کی میں نے کبھی بات کی تھی کچھ دروس میں؛ "الرخص الشرعیۃ": شریعت میں جو آسانیاں اور رخصتیں دی گئی ہیں کتنی قسم کی ہیں؟ چھ قسم کی ہیں شرعاً۔

نفل نماز ہے، نفل نماز کے لیے آپ بیٹھ کر نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن حدیث میں آیا ہے کہ اُس کا آپ کو آدھا اجر ملے گا؛ بغیر عذر شرعی کے اگر آپ نفل نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہے کہ نفل نماز سواری پر بیٹھ کر بھی پڑھا کرتے تھے اور بعض اوقات وتر کی نماز کے بعد دو رکعت بیٹھ کر بھی پڑھا کرتے تھے (علیہ الصلاۃ والسلام)۔

تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نفل کی نماز آپ بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اور القیام مع القدرۃ کی جو شرط یا رکن ہے یہ فرض نمازوں کے لیے ہے۔ اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جب انسان بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے (نفل نماز) تو اس کا جو اُجر ہے وہ قائم شخص کے (کھڑے ہو کر پڑھنے والے شخص سے) آدھا اُجر ہے۔

اگر کوئی شخص صلاۃ اللیل پڑھنا چاہتا ہے (تہجد کی نماز پڑھنا چاہتا ہے) کوئی عذر شرعی نہیں ہے اس کے پاس (یعنی کوئی درد، تکلیف، کوئی بھی بیماری یا کوئی اور وجہ نہیں ہے) اور بیٹھ کر پڑھنا چاہتا ہے پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟ پڑھ سکتا ہے۔

اب انسان کے لیے بہتر کیا ہے کہ وہ اگر سوچتا ہے کہ میں کھڑے ہو کر پڑھوں گا تو تھکا ہوا ہوں (تھکاوٹ ہے) ابھی کام سے آیا ہوں مشکل ہے چلو کل پڑھ لوں گا میں؟ یہ بہتر ہے؛ یا بیٹھ کر پڑھنا بہتر ہے؟ بیٹھ کر پڑھنا بہتر ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالیں۔

شیطان یہ چاہتا ہے (اور بڑے وسوسے آتے ہیں) کہ تم سارا دن حلال کمائی کماتے رہتے ہو، سارا دن تگ و دو میں رہتے ہو اب اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے کیا ضرورت ہے ابھی پڑھنے کی؟! بعد میں پڑھ لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ان شاءاللہ آپ کو اُجر بھی اللہ تعالیٰ دے دے گا۔

اجر اُس کو ملے گا جس کو عادت ہو روزانہ پڑھنے کی، کبھی تھکاوٹ یا تکلیف کی وجہ سے نہ پڑھ سکا، یا کبھی اسے نیند کا غلبہ آ گیا اور وہ سو گیا اور نہ پڑھ سکا اُس کو تو اُجر ملے گا ان شاءاللہ، لیکن جو پڑھتا ہی نہیں ہے اور شیطان اسے کہتا ہے مت پڑھو اور یہ بھی اسے وسوسہ دیتا ہے غلط کہ تمہیں ویسے ہی اُجر ملے گا، اُس کو کیسے اُجر ملے گا؟! ہاں! اگر اس کی نیت ہے اب اٹھنے کی کہ میں اٹھ کر پڑھوں گا تو نیت کا اُجر تو اسے ملے گا، لیکن پکی نیت ہو کچی نیت نہ ہو کیونکہ کچھ ایسی نیتیں بھی ہوتی ہیں، "العزم": نیت میں عزم کرنا پڑھتا ہے۔

الغرض؛ کیونکہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں، ایک ہوتی ہے چستی کی حالت ایک ہوتی ہے سستی کی حالت۔ ایسا ہوتا ہے کہ نہیں؟ جب انسان چستی محسوس کرتا ہے تو اسے آگے آگے ہونا چاہیے عبادات میں؛ فرائض تو ویسے بھی آپ نے ہر صورت میں کرنے ہیں لیکن جو نوافل ہیں اگر چستی محسوس کرتے ہیں آپ تو اس میں کمی نہ رکھیں اور کریں عبادت، اور اگر آپ سستی محسوس کرتے ہیں تو اس کے مطابق اس میں کچھ کمی بھی کر دیں کوئی حرج نہیں ہے (میں نوافل کی بات کر رہا ہوں) تا کہ آپ کی جو نفس ہے وہ اس عبادت کو اپنے دل سے قبول کر کے کرے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو صلاۃ اللیل تو پڑھتے ہیں لیکن دل سے نہیں پڑھتے (صرف پڑھتے ہیں)، تھکے بھی ہوتے ہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کیا پڑھ رہے ہیں، تو اس سے بہتر ہے کہ وہ آرام سے سو جائیں اُٹھ کر پڑھ لیں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب آپ اپنے نفس پر زور زبردستی کریں گے تو عبادت کی جو چاشنی ہے جو مزہ ہوتا ہے آپ اس سے محروم ہو جاتے ہیں اور جسم عبادت کرتا رہتا ہے صرف؛ اگر آپ دل سے کرنا چاہتے ہیں تو دل کی جو لذت جو چاشنی ہے وہ الگ ہے، تو عبادت کا حق اور نوافل کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے اُس شخص کو جس کو نماز میں اونگھ آ جاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "تم میں سے اگر کوئی شخص نماز پڑھے جبکہ اُسے نیند کا غلبہ ہو جائے یا اُسے اونگھ آ جائے تو اسے یہ نہیں پتہ کہ وہ استغفار پڑھ رہا ہے یا (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو بُرا بھلا کہہ رہا ہے"۔

اب نیند کے غلبے میں کیا کہہ سکتے ہیں متفق علیہ حدیث ہے!

یعنی کوئی شخص نیند سے اُٹھا ہے وہ تہجد پڑھنا چاہتا ہے، آنکھیں اُس کی بند ہیں اور پتہ نہیں وہ بس پڑھنا چاہتا ہے؛ اُس کو پتہ ہی نہیں ہے وہ کیا کہہ رہا ہے! نیند کا کبھی غلبہ آ جاتا ہے اور زبان سے کچھ باتیں نکل آئیں نیند کے غلبے کی وجہ سے تو اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ نماز نہ پڑھیں سو جائیں اور اُٹھ کر پڑھ لیں؟!

اور اسی وجہ سے آپ یہ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلق سے جب روزے کے بارے میں پوچھا جاتا تو بعض صحابہ فرماتے ہیں "کہ روزہ رکھتے یہاں تک کہ ہم کہتے کبھی افطاری کرتے نہیں ہیں"؛ اور بعض صحابہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ نہیں رکھتے "ہمیں یوں لگتا کہ کبھی روزہ رکھتے نہیں ہیں" (یعنی نفل روزہ جو ہے؛ اور یہ متفق علیہ حدیث ہے)، اور اسی طریقے سے قیام کے تعلق سے اور نیند کے تعلق سے بھی۔

یعنی قاعدہ یہ ہے شیخ صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ آپ جب عبادت کرنا چاہتے ہیں تو عبادت کا حق ادا کریں، اور عبادت کا حق تب ادا ہوتا ہے جب آپ دل سے عبادت کرتے ہیں رغبت کے ساتھ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی عبادت ہو اس کے تین (3) ارکان ہیں (شرطیں دو ہیں نا، ارکان تین ہیں)۔ کون سے ارکان ہیں تین؟ (۱) سب سے پہلے محبت۔ (۲) دوسرے نمبر پر امید۔ (۳) تیسرے نمبر پر ڈر۔

محبت کس چیز کی؟ (۱) اللہ تعالیٰ سے محبت جس نے ہمیں حکم دیا ہے عبادت کا۔ (۲) اس عبادت سے محبت جو ہم کرنے جارہے ہیں (تو دل سے ہم نے محبت کرنی ہے)۔

دل کے اعمال ہیں نا یہ تین اعمال؟ دیکھیں نا محبت ہے، امید ہے، ڈر ہے، دل کے اعمال ہیں نا؟! تو جب دل حرکت میں آتا ہے اور چاہتے ہوئے (محبت چاہت ہی ہوتی ہے نا) آپ یہ عمل کرتے ہیں اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اُجر دے گا، اور آپ کو یہ ڈر بھی لاحق ہوتا ہے کہ پتہ نہیں عبادت قبول ہوتی ہے کہ نہیں ہوتی ہے؟! کیا میں اُس کا حق ادا کر رہا ہوں کہ نہیں کر رہا ہوں؟! (سبحان اللہ)؛ کہیں کوئی کمی کوتاہی تو نہیں ہو گئی ہے؟!

آپ کیفیت دیکھیں عبادت کرتے وقت، مسلمان کی یہ کیفیت ہونی چاہیے تاکہ عبادت کا حق ادا ہو سکے۔

اور جتنی کمزوری ہوتی ہے ان تین چیزوں میں اتنی ہی عبادت میں کمزوری ہوتی ہے (سبحان اللہ)۔

3- شیخ صاحب فرماتے ہیں: اور اس حدیث میں ہمیں یہ بھی فائدہ ملتا ہے یہ پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے، اور اس کی دلیل ہمیں قرآن مجید میں بھی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورۃ البقرۃ آیت نمبر 186 میں:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ إلى آخر الآية؛ (اے میرے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب میرے بندے آپ سے میرے تئیں سوال کریں) ﴿فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ (بے شک میں قریب ہوں) ﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (میں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے) (البقرة:186)۔

﴿اِذَا دَعَانِ﴾: یعنی "إِذَا دَعَانِي"؛ شرط ہے: ﴿اِذَا﴾ شرطیہ ہے (شرط یہ ہے)۔

اور آپ یہ دیکھیں کہ قرآن مجید میں یہ واحد جگہ ہے جہاں پر اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی سوال کیا گیا اس میں "قُل" کا لفظ نہیں ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى﴾ (البقرة:222)؛ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ﴾ (الاعراف:187)۔

اور اس میں دیکھیں: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ﴾ قُل فَإِنِّي قَرِيبٌ، یا ﴿فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾؟ (سبحان اللہ)۔

علماء فرماتے ہیں یہ اس لیے ہے کہ یہاں پر قرب کا ذکر ہے؛ سیاق اور سباق میں آپ دیکھیں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے کتنا نزدیک ہے کہ بیچ میں "قُل" کی جگہ بھی نہیں ہے، اتنا زیادہ قریب ہے۔

لفظ کے اعتبار سے بھی دیکھ لیں آپ کہ معنی کتنا قوی ہے! (سبحان اللہ)۔

4- اور یہ بھی فائدہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بیچ میں کسی واسطے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کے قریب ہے۔

اور مسلکی اعتبار سے ہمیں جو اس حدیث سے فائدہ ملتا ہے:

1- وہی جیسے پہلے گزر چکا ہے کہ ہمیں چاہیے ہم اپنی عبادات کرتے وقت اپنے آپ مشقت نہ ڈالیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہمارا جو راستہ ہے جو عبادت کا طریقہ ہے وہ میانہ روی میں ہونا چاہیے؛ وسطیت: "لا تفريط ولا إفراط"۔

2- اور اس میں یہ بھی ہمیں فائدہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیں خبردار رہنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ سمیع ہے قریب ہے اور بصیر ہے، تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اور مخالفت سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔

3- اس میں یہ بھی فائدہ ملتا ہے ہمیں حکم کے اعتبار سے کہ یہ جائز ہے آپ کسی غائب چیز کی مثال حاضر کے ساتھ بیان کریں وضاحت کے لیے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا ہے: "کہ جسے تم پکارتے ہو یقیناً وہ آپ میں سے کسی کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے"۔

4- اور اس میں یہ بھی ہمیں فائدہ ملتا ہے (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں) کہ انسان کو چاہیے جب کسی معانی کو بیان کرتے ہوئے اگر سمجھانا چاہتا ہے لوگوں کی فہم کی آسانی کے لیے سمجھنے کی آسانی کے لیے تو اسے مثال بھی ویسی ہی دینی چاہیے جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر میں تھے صحابہ بھی سفر میں تھے اور سب اپنی اپنی سواری پر تھے تو پھر یہ مثال دی اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اور سب سے بہترین مثال کیا ہوتی؟!)۔

یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی شخص کے کتنا قریب ہے اب غور کریں ذرا: آپ اونٹ پر سوار ہیں (اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، صحابہ بھی ساتھ ہیں اور بات کیا ہو رہی ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ کتنا قریب ہے۔ یعنی اب سفر پر جا رہے ہیں کسی بلند جگہ پر گئے تو بڑی بلند آواز سے تکبیر پڑھی، نیچے اُترے تو بڑی بلند آواز سے بڑے زور سے تسبیح

پڑھی؛ تو اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام (دیکھیں تربیت دیکھیں، سبحان اللہ) نے فوراً سمجھایا ہے کہ جسے تم پکارتے ہو نہ وہ بہرا ہے نہ ہی وہ غائب ہے، وہ خوب سننے والا ہے خوب دیکھنے والا ہے۔ اور کتنا قریب ہے اللہ تعالیٰ اب مثال کیا ہونی چاہیے بتائیں؟! اب اس سے پیاری مثال کیا ہو گی کہ آپ اپنی آنکھوں سے اونٹ کی گردن دیکھ رہے ہیں اونٹ کا سر سامنے ہے گردن سامنے ہے کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی شخص کے کتنا زیادہ قریب ہے؟ اس اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

تو مثال دیتے وقت اگر آپ کوئی مثال دینا چاہتے ہیں تو آپ ماحول کو دیکھ کر اس کے مطابق مثال دیں تاکہ سمجھنے والے کو آسانی سے سمجھ آئے اور سمجھانے والے کے لیے بھی آسانی ہو؛ اب سمجھانے والا ایک چیز سمجھانا چاہتا ہے اور اگر دور کی کوئی مثال دے مثالیں تو بہت ہیں لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ جو سمجھنا چاہتا ہے جسے میں سمجھانا چاہتا ہوں کیا وہ سمجھ رہا ہے کہ نہیں سمجھ رہا؟

اور آسان ترین طریقہ کیا ہے اسے سمجھانے کا یہ ہمیں ملتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں (سبحان اللہ) یعنی ایسی تربیت کی ہے صحابہ کی اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے واللہ! اس کی آپ کو کہیں مثال نہیں مل سکتی! اور جو حکمت اور بلاغت اور دعوت اور تبلیغ کا جو ایک بہترین طریقہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے وہ بھی بے مثال ہے! (سبحان اللہ)، اور واللہ! اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام نے اس کا حق ادا کیا ہے۔

یعنی آپ یہ دیکھیں کہ کوئی بھی ایسی چیز جو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے نہیں ہے اِلَّا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس کو مکمل وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہمیں دور کر دے اِلَّا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ہمیں خبردار کیا ہے (علیہ الصلاۃ والسلام)۔

اگلی حدیث، حدیث نمبر سولہ (16) شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الحديث السادس عشر: إثبات رؤية المؤمنين لربهم" (مومنوں کا اپنے ربّ کے دیدار کا ثبوت) "وهو قوله صلى الله عليه وسلم" (اور اس کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے) "إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لا تُضَامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ، فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لا تُغْلَبُوا عَلَى صَلاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَصَلاةٍ قَبْلَ غُرُوبِهَا؛ فَافْعَلُوا": متفق علیہ۔

آپ غور کریں جتنی بھی احادیث بیان ہوئی ہیں تقریباً اکثر احادیث جو ہیں متفق علیہ حدیث ہے، اور متفق علیہ حدیث جو ہے صحت کے اعتبار سے بلند ترین درجے پر فائز ہے، محدثین کا اتفاق ہے اس پر؛ لیکن اہل باطل نے ایک چور دروازہ کھولا ہے! (دیکھیں نا آپ جب سنت سے دور ہوتے ہیں اور سنت کے طریقے سے دور ہوتے ہیں تو پھر شیطان اپنا کام کر لیتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا انکار کرنے والوں نے ایک چور دروازہ کھولا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا انکار کرنے کے لیے کیا چور دروازہ ہے؟ "کہ احادیث آحاد عقیدے میں قابل قبول نہیں، متواتر ہونی چاہیے حدیث تاکہ ہم اسے عقیدے کے لیے بطور ثبوت مان لیں"۔

عقیدے کا کوئی مسئلہ بھی ہو، ایمانیات کا کوئی مسئلہ بھی ہو تو حدیث کو (یہ شرط ہے اُن کے نزدیک متفق علیہ ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا اُنہیں) متواتر ہونا چاہیے۔

اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ قاعدہ سرے سے اس کی نہ کوئی دلیل ہے، نہ کوئی سَر ہے نہ کوئی پاؤں ہے، یہ محض ایک شیطانی وسوسہ ہے ان لوگوں نے اس کو قاعدہ بنا دیا ہے! کہتے ہیں نا کہ عقل کو مقدم کیا قرآن اور سنت پر اور عقل سے ہی مار کھائی ہے اُن لوگوں نے!

اور آئمہ سلف نے بھی ان کے اس قاعدے کا بھرپور ردّ کیا ہے؛ یعنی امام ابو حنیفہ اور امام شافعی (رحمھما اللہ) کا یہ جملہ کافی ہے اس باطل وسوسے کے ردّ میں "إذا صح الحديث فهو مذهبي"۔

یعنی قرآن اور سنت کے جو نصوص ہیں وہ تو بے شمار ہیں ان کی میں بات نہیں کر رہا کیونکہ وہ اسے مانتے نہیں ہیں، چلو ہم بھی آپ کے امام ہی کی بات کر لیتے ہیں: "إذا صح الحديث فهو مذهبي" کے اس جملے میں کہیں پر حدیث آحاد کا یا متواتر کا ذکر ہے یا حدیث کی صحت کا ذکر ہے؟ "إذا" شرطیہ ہے کہ نہیں؟ تو شرط کیا ہونی چاہیے حدیث کا آحاد یا متواتر ہونا یا حدیث کا صحیح ہونا آپ کے امام کے نزدیک؟ تو آپ کس منہ سے کہتے ہیں کہ آپ حنفی ہیں جبکہ آپ اپنے اس امام کے قاعدے پر بھی عمل نہیں کر پا رہے ہے؟!

اس لیے اُن کو کہنا پڑا کہ ہم اصول میں اَشعری ماتریدی ہیں، حنفی نہیں ہیں اصول میں! کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصول تو یہ ہیں اپنے امام کے اصول کو کیوں چھوڑا؟!

أشاعرہ ماتریدیہ نے یہ اصول کہاں سے لیا؟ معتزلہ سے لیا، یہ اصول معتزلہ کا ہے؛ معتزلہ سے پہلے اس اصل کا نام ہی نہیں تھا کہ حدیث کو جو ہے متواتر ہونا چاہیے عقیدے کے مسائل میں، آحاد حدیث کو ہم نہیں مانتے (سبحان اللہ): "إذا صح الحديث فهو مذهبي"۔

یہ حدیث جو ہے اس میں واضح ثبوت ہے کہ مومن قیامت کے دن جنت میں اپنے ربّ کا دیدار کریں گے، یا عمومی طور پر قیامت کے دن مومن اپنے ربّ کا دیدار کریں گے۔

اچھا ذرا الفاظ دیکھیں؛ شرح میں شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ": السين للتحقيق": سین کا حرف جو ہے مستقبل قریب کے لیے ہوتا ہے اور تحقیق کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور فعل مضارع کو مستقبل کے لیے بنا دیتا ہے کیونکہ مضارع میں حال، مستقبل دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب سین کا لفظ یا حرف ساتھ لگ جائے فعل مضارع کے تو پھر حال کا معنی اس سے ختم ہو جاتا ہے اور باقی مستقبل کا معنی اس میں رہ جاتا ہے، جیسا کہ "لم" جو ہے جب فعل مضارع کے ساتھ لگ جائے تو ماضی کا معنی دیتا ہے: "لم يأكل": کیا وہ نہیں کھائے گا یا نہیں کھا رہا، یا نہیں کھایا ماضی میں؟ "لم يأكل ، لم يشرب" کیا خیال ہے؟ نہیں کھایا (ماضی میں)۔

یہ فعل مضارع ہے ماضی کیسے ہو گیا؟ کیونکہ "لم" نفی اور جزم کے لیے ہے اور آپ اسے "لم يأكل" جزماً کہہ رہے ہیں، یقیناً کہہ رہے ہیں جزم کے ساتھ کہ اس نے کھانا نہیں کھایا، یا اس نے کھایا نہیں ہے۔

"سوف يأكل": اس میں ابھی کھائے گا یا کچھ دیر کے بعد کھائے گا مستقبل میں؟ مستقبل میں کھائے گا۔

تو ابھی کھانے کی بات نہیں ہو رہی نا جبکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں ہیں، تو "لم" جب فعل مضارع میں داخل ہوتا ہے تو اس کا معنی جو ہے ماضی میں بدل جاتا ہے جبکہ حال مستقبل میں تھا، اور جب "سین یا سوف"، سوف کا لفظ بھی مستقبل کے لیے، "سوف" تھوڑا دور، اور "سین" قریب۔

دیکھیں سوف میں تین حروف ہیں، سین میں ایک حرف ہے: تو مستقبل قریب ہے تو سین، اور مستقبل بعید ہے تو سوف۔

الغرض؛ تو یہ فعل مضارع کے ساتھ یہ حرف السین لگتا ہے تو معنی جو ہے وہ مستقبل میں بدل جاتا ہے۔

"سَتَرَوْنَ" (یعنی عنقریب دیکھو گے (سبحان اللہ)) "رَبَّكُمْ" (اپنے ربّ کو): اور خطاب مومنین کے لیے ہے۔

’’كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ‘‘: کاف تشبیہ کے لیے ہے؛’’تَرَوْنَ‘‘(تم دیکھتے ہو)’’الْقَمَرَ‘‘(چاند کو)۔

’’تَرَوْنَ‘‘: یہ رؤیۃ بصریۃ ہے (آنکھوں کا دیکھنا ہے): کیونکہ ہم چاند کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں (کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دل سے): چاند کو دل سے دیکھتے ہیں یا آنکھوں سے دیکھتے ہیں؟ آنکھوں سے دیکھتے ہیں "رؤیۃ بصریۃ" ہے، یعنی آنکھوں سے دیکھنا۔

اور ’’(ما)‘‘ مصدریہ ہے: اس میں دیکھیں اور تشبیہ جو ہو رہی ہے وہ دیکھنے کی ہو رہی ہے (رؤیت کی)، اس سے نہیں تشبیہ جسے دیکھا جا رہا ہے؛ یعنی قمر کو اللہ تعالیٰ سے تشبیہ نہیں دی جا رہی یہ فرق سمجھیں ذرا کیونکہ مخالفین نے جو منکرین صفات ہیں انہوں نے یہ کہا ہے کہ آپ لوگ تو اللہ تعالیٰ کو چاند سے تشبیہ دے رہے ہیں: نہیں، ہرگز نہیں!

یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام جو ہیں وہ کوئی ایسا (نعوذ باللہ) غلط معنی بیان کریں؟!

تو اصل معنی جو ہے اصل پیغام جو ہے یہ ثابت کرنا ہے کہ دیکھنا (وژن Vision جو ہے) جو رؤیہ ہے جو آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے یہ جو دیکھنا ہے اس کی تشبیہ ہے "کہ جیسے تم دیکھتے ہو اس چاند کو عنقریب اپنے ربّ کو ایسے ہی تم دیکھو گے"۔ تو تشبیہ رؤیت کی ہے نا کہ مرئی (جسے دیکھا جا رہا ہے)۔

اس کے اور ثبوت بھی اسی حدیث میں ہیں کہ اصل مقصد جو ہے وہ رؤیہ ہے، نا کہ مرئی (جسے دیکھا جا رہا ہے)۔

’’كَمَا‘‘: کاف تشبیہ کے لیے ہے ’’مَا‘‘ کیا ہے؟ یہ مصدریہ ہے، مصدریہ جو ہے وہ جو فعل ہے اس کے بعد جس کا ذکر کیا جا رہا ہے اسے مصدر میں بدل دیا جاتا ہے۔ فعل کون سا ہے؟’’تَرَوْنَ‘‘:’’سَتَرَوْنَ ، تَرَوْنَ‘‘۔

اس کا مصدر کیا ہے؟"رؤیۃ": (رائی کا رؤیہ ہے نا؟): رأى ، يَرَى ، تَرَى، تَرَوْنَ، یہ افعال اسی فعل رائی کے افعال ہیں نا سارے؟ رائی کا مصدر کیا ہے؟ رؤیہ ہے۔’’كَمَا تَرَوْنَ‘‘: قاعدہ کیا ہے؟ ما مصدریہ کے بعد جو فعل ہے اسے مصدر میں بدل دیں، تو کاف کے بعد ما کو نکال کر فعل کو نکال کر کاف کے ساتھ مصدر کو جوڑ دیں۔ کیا بنے گا؟ كرؤيتكم: (سبحان اللہ)؛’’كرؤيتكم القمر‘‘: (جیسے کہ تم چاند کو دیکھتے ہو)۔

دیکھیں عربی گرامر کے اعتبار سے بھی ان کی جو غلط فہمی تھی دور ہوئی کہ نہیں؟ لیکن اُن لوگوں نے دیکھیں (سبحان اللہ) ہٹ دھرمی دکھائی پھر بھی کہتے ہیں: نہیں! اس حدیث سے یہ لازم آتا ہے کہ چاند کو تشبیہ دی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ سے (نعوذ باللہ) اس لیے یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے دیدار کے لیے درست نہیں ہے۔

ایک تو متواتر نہیں ہے نہیں مانتے آحاد ہے، اور اس لیے بھی کہ اس میں جو تشبیہ ہے اگر ہم مان لیں کہ تشبیہ ہے اس میں تو (نعوذ باللہ) یہ تو پھر (اُن کے نزدیک) کفر تک بات چلی جاتی ہے کہ کیسے چاند کو اللہ تعالیٰ سے تشبیہ دی جا رہی ہے؟! نعوذ باللہ۔

لیکن اس حدیث کے جو الفاظ ہیں بالکل واضح ہیں، اور جو قاعدہ ہے مَا مصدریہ کا اس کے بعد اگر فعل ہے تو پھر "مَا" اور فعل کو نکال کر اس کی جگہ جو مصدر ہے اسے بیان کیا جاتا ہے؛ اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ تشبیہ جو ہے وہ رؤیت کی ہے جیسا کہ شیخ صاحب فرماتے ہیں: ''فالتشبيه حينئذ للرؤية بالرؤية ، وليس للمرئي بالمرئي ، لأن الله تعالىٰ ليس كمثله شيء''۔

تیسری دلیل کیا ہے؟ ''ليس كمثله شيء'': اگر تشبیہ کی بات بھی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی چیز بھی نہیں ہے (سبحان اللہ)۔

پھر شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ): اور اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام بعض اوقات معنی کو قریب کرنے کے لئے واقع اور حسّی مثالیں بیان فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ایک مرتبہ ابو رزین العقیلی لقیط بن عامر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''يَا رَسُولَ اللهِ! أَكُلُّنَا يَرَى رَبَّهُ يَوْمَ القيامَةِ؟'' (کیا ہم سب اپنے ربّ کا دیدار کریں گے قیامت کے دن؟) ''وَمَا آيَةُ ذٰلِكَ فِي خلقِهِ؟'' (اور اپنی خلق میں اُس کی کیا آیت ہے؟) ''فقال النبي صلى الله عليه وسلم'' (اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) ''كُلُّكُمْ يَنْظُرُ إِلَى الْقَمَرِ مُخْلِيًا بِهِ؟'' (کیا تم میں سے ہر شخص چاند کو اکیلے اکیلے دیکھ لیتا ہے؟) ''قَالَ: بَلَى'' (عرض کرتے ہیں، بے شک) ''قَالَ النبي صلى الله عليه وسلم: فَاللَّهُ أَعْظَمُ'' (اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ عظیم ہے)۔

اسے احمد، ابوداود، اور حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح حدیث ہے؛ تو اس حدیث میں بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر شخص جو ہے وہ اپنے ربّ کا دیدار کرے گا قیامت کے دن (ہر مومن جو ہے)۔

صحیح مسلم کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے حدیث قدسی میں: ''أَنَّ اللَّهَ يَقُولُ: قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ'' (میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے بیچ میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے) ''فإذا قال: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الفاتحة آية 2): قال: حَمِدَنِي عَبْدِي''

(جب نمازی یہ کہتا ہے﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے "حَمِدَنِي عَبْدِي" میرے بندے نے میری حمد وثناء کی ہے)؛إلى اخر الحديث۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور اس میں دیکھیں کہ ہر نمازی کے لیے ہے یہ، یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ تمام نمازی جو ہیں ایک وقت میں اگر نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ سب کو الگ الگ جواب دیتا ہے "حَمِدَنِي عَبْدِي"، ایک ہی وقت میں ۔یعنی کوئی شخص کیسے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب الگ الگ کیسے دیکھیں گے؟! یعنی مکمل طریقے سے ہر مومن اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔

ایک تو ہے چاند کو دیکھنا، پچھلی حدیث میں جو متفق علیہ حدیث ہے آگے اور مزید بھی اس کی وضاحت ہے؛ پھر ہر بندہ الگ الگ دیکھے گا۔ الگ الگ کا ذکر کیا ہے؟

یعنی کوئی رَش ایسا نہیں ہوگا جس میں کوئی مشکل یا کوئی دقت ہوگی دیکھنے میں، نہیں! جیسے کہ چاند کو کوئی شخص الگ سے دیکھ لیتا ہے اور مکمل طریقے سے دیکھتا ہے اطمینان سے دیکھتا ہے اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی قیامت کے دن ایسے ہی ہوگا۔

"كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ": "لَيْلَةَ الْبَدْرِ" (چودھویں کا چاند)؛ بدر کہتے ہیں چودھویں کے چاند کو۔

چودھویں کا چاند ہم کہتے ہیں اسے چاند مکمل صرف چودہ تاریخ کو ہوتا ہے لازمی ہے؟

تیرہ بھی ہو سکتا ہے "تیرھویں کا چاند"۔

پندرہ بھی ہو سکتا ہے؟ پندرہ بھی ہو سکتا ہے؛ "یوم البیض" (تیرہ، چودہ، پندرہ (یوم البیض))۔

وہ ٹھیک ہے لیکن یہ فرق کیوں ہے کبھی تیرہ، کبھی چودہ، کبھی پندرہ؟ مہینہ کتنے دن کا ہوتا ہے؟

انیتس یا تیس دن کا۔ تو اس لیے اگر صرف فکس ہوتا تو فکس ہونا چاہیے تھا، درمیان کی رات ہوتی ہے؛ کبھی مہینہ انیتس کا ہوتا ہے کبھی تیس کا ہوتا ہے، اس اعتبار سے چاند آہستہ آہستہ اُس کا سائز بڑھتا جاتا ہے مشرق سے مغرب کی طرف جاتے ہوئے آہستہ آہستہ، جو مہینے کا مڈ (Mid) ہوتا ہے تو مکمل ہو جاتا ہے، پھر جیسے ہی مہینہ ختم ہوتا ہے تو چاند کا سائز بھی چھوٹا چھوٹا دوبارہ واپس چلا جاتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے۔

تو اس اعتبار سے تیرہویں کا چاند بھی کہیں گے تو چلے گا لیکن لوگ نہیں سنیں گے آپ کی بات، لوگ کہیں گے کہ پتہ نہیں مولوی صاحب کو کیا ہو گیا ہے تیرہویں کا چاند کہتے ہیں چودھویں کا نظر نہیں آتا اُسے۔ تو چاند تیرہویں کا بھی ہو سکتا ہے مکمل۔

"لَا تُضامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ": ذرا اس جملے پر غور کریں کہ یہ لفظ جو ہیں "لَا تُضامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ" اس کا ترجمہ کیا ہے؟ اس لفظ کو تین مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، ایک چوتھا لفظ بھی ہے "لَا تُضَارُّونَ": تو چار لفظ ہو گئے ہیں اس جملے میں: "لَا تُضامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ، لَا تَضَامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ، لَا تُضَامُونَ فِي رُؤْيَتِهِ، لَا تُضَارُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ"۔

یعنی "تُضامُّونَ" کے تین ہیں، اور ایک ہے "لَا تُضَارُّونَ"، ضاد کے ساتھ ضرر سے۔

"لَا تُضَامُونَ: بضم التاء وتخفيف الميم": "لَا تُضَامُونَ"؛ ایک ہے "تُضامُّونَ"، ایک ہے "تُضَامُونَ": جو تخفیف کے ساتھ ہے یعنی "تمہیں اللہ تعالیٰ کے دیدار میں کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا"؛ یعنی کوئی زیادہ کوئی کم دیکھے گا ایسے نہیں، سب دیکھیں گے برابر طریقے سے دیکھیں گے کسی پر کوئی ظلم یا کوئی کمی نہیں ہو گی اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو یعنی رکاوٹ نہیں بنے گا اللہ تعالیٰ کے دیدار میں، سب دیکھیں گے۔

"لَا تُضامُّونَ": میم کی تشدید کے ساتھ اور تاء کے فتح یا ضمہ کے ساتھ: یعنی "تَضَامُّون" اور "تُضامُّونَ"؛ دونوں لفظ ٹھیک ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتے ہوئے لازمی نہیں ہے کہ تم سب ایک ساتھ مل کر دیدار کرو۔

ایک ساتھ سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ بعض اوقات جب ہم چاند دیکھتے ہیں مہینے کی ابتداء میں تو الگ الگ دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے تو مختلف لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں ایک کمیٹی بنتی ہے جسے ہلال کمیٹی کہتے ہیں، سب دیکھتے ہیں اور اشارہ بھی کرتے ہیں ایک دوسرے کی طرف کہ دیکھو اُدھر تو نظر نہیں آ رہا، اُدھر تو نظر نہیں آ رہا۔ ایسے ہوتا ہے نا؟

تو زیادہ کثرت میں اس لیے بعض اوقات لوگ جمع ہوتے ہیں تاکہ دیکھنے کی تاکید ہو اور دیکھنے میں ایک دوسرے کے لیے آسانی کا سبب بنے، ایسا بھی نہیں ہو گا اس کی بھی نفی کی گئی ہے۔

اور تیسرا جو ہے "لَا تُضَارُّونَ": یعنی تمہیں کوئی ضرر لاحق نہیں ہو گا بلکہ مسلمان جو ہے اپنے ربّ کا دیدار کرے گا (مومن جو ہے) تو وہ مکمل راحت اور اطمینان کی حالت میں ہو گا۔

اب (سبحان اللہ) الفاظ دیکھیں ذرا ابھی بھی کسی کو شک وشبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو گا یا ممکن نہیں ہے؟!

اور حدیث کے آخری الفاظ: ’’فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لا تُغْلَبُوا عَلَى صَلاةٍ قَبْلَ طُلوعِ الشَّمْسِ وَصَلاةٍ قَبْلَ غُروبِها؛ فَافْعَلوا‘‘: یعنی تم میں سے اگر کوئی شخص یہ استطاعت رکھتا ہے کہ اسے غلبہ نہ آئے کہ وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز پڑھے اور غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھے تو وہ یہ نماز ضرور پڑھے۔

’’فَافْعَلوا‘‘: فعل اُمر ہے۔

یہ کون سی نماز ہے؟ فجر اور عصر؛ فجر کی نماز سورج نکلنے سے پہلے، اور عصر کی نماز سورج کے غروب ہونے سے پہلے۔ اور دونوں میں سے افضل کون سی ہے عصر ہے یا فجر ہے؟ دونوں کہا گیا ہے مزے کی بات ہے (عصر بھی کہا گیا ہے اور فجر بھی کہا گیا ہے)، اور عصر جو ہے افضل ہے کیونکہ صلاۃ الوسطیٰ ہے اور اس کی خصوصیت ہے حفاظت کرنے کی:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (البقرۃ:238): سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

تمام نمازوں کو عموم سے حفاظت کا ذکر کرنے کے بعد حکم دینے کے بعد صلاۃ الوسطیٰ کا خصوصی طور پر حکم دیا ہے کہ تمام نمازوں کی حفاظت کرو خصوصی طور پر صلاۃ الوسطیٰ کی بھی حفاظت کرو، اور یہ کون سی نماز ہے؟ عصر وسطیٰ کیسے ہے؟ دو پہلے، دو بعد میں؛ دو پہلے "فجر اور ظہر"، اور دو بعد کی "مغرب اور عشاء"، درمیان میں وسطیٰ جو ہے وہ عصر کی نماز ہے۔

اور فجر کو بھی افضل کہا گیا ہے کسی اور اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سورۃ الاسراء آیت نمبر 78 میں: ﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (الاسراء:78): اور ﴿مَشْهُوْدًا﴾ سے مراد فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں؛ اور ﴿قُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾ سے مراد صلاۃ الفجر ہے۔ قرآن کیوں کہا گیا ہے؟ کیونکہ اس میں وہ نماز ہے جس میں قرأت لمبی ہوتی ہے (زیادہ کی جاتی ہے)، تو قرآن کہا گیا ہے (سبحان اللہ)، اگر ظاہر کو دیکھا جائے تو تلاوت قرآن ہے۔

ایک فائدہ یہاں پر دیکھ لیں آپ بڑا ایک عظیم فائدہ ہے کہ اگر صرف ظاہر کو لیا جائے ﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾: ظاہر کو دیکھا جائے تو تلاوت قرآن ہے، لیکن جب حدیث کو ساتھ رکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تلاوت قرآن اس سے مراد نہیں بلکہ فجر کی نماز ہے۔

تو معنی واضح ہوا کہ نہیں؟ تفسیر بہترین طریقے سے ہو گئی کہ نہیں؟ (سبحان اللہ)۔

اس لیے قرآن مجید کے ظاہر کو صرف دیکھ کر تفسیر کرنا کافی نہیں ہے، بعض اوقات کافی بھی ہوتا ہے جس میں اگر کوئی اور معنی نہیں ہے؛ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو معنی کیا ہے؟ تلاوت قرآن ہے۔ جب حدیث آگئی ہے تو پھر یہ معنی مخصوص ہو گیا ہے قرأت قرآن سے ہٹ کر نماز کے لیے۔

اور حدیث میں آیا ہے: "مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ" (جس نے بَرْدَیْن نمازیں پڑھیں (دونوں) تو جنت میں داخل ہوا)۔ اور بَرْدَیْن کون سی ہیں؟ "الفجر والعصر": (یہ حدیث بھی متفق علیہ حدیث ہے)۔

اس حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر ہوا ہے؛ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا ثبوت (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے)، اور جن آیات میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا ثبوت ہے وہاں پر شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ شرح ہو چکی ہے چار آیات ہیں، اور احادیث جو ہیں اس میں متواتر احادیث ہیں (شیخ صاحب فرماتے ہیں جبکہ مخالفین اس کو نہیں مانتے)، تو اللہ تعالیٰ کے دیدار میں جو احادیث متواتر احادیث ہیں اور ان کا ثبوت جو ہے قطعی ہے، اور دلالت بھی قطعی ہے (تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ظنّی ہے)۔

اور اس لیے (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں): کہ بعض علماء نے یہ کہا ہے (یا اس طرف گئے ہیں) کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کیا ہے تو وہ کافر اور مرتد ہے (نعوذ باللہ)۔

جیسا کہ ابن القیم رحمہ اللہ نے حادی الأرواح میں، امام احمد رحمہ اللہ اور اُن کے علاوہ بھی آئمہ کا قول نقل کیا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کیا ہے وہ کافر ہے؛ یہ بھی سلف کے اقوال میں سے قول موجود ہے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں (شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ):

واجب یہ ہے ہر مومن پر کہ وہ اس بات پر ایمان لائے اس کا اقرار کرے؛ اور جس نے یہ کہا ہے کہ وہ کافر ہے (یعنی جو اللہ تعالیٰ کے دیدار کا انکار کرتا ہے اس لیے) کیونکہ جو دلائل ہیں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے تعلق سے وہ "قطعية الثبوت وقطعية الدلالة" دلیل بھی قطعی ہے اور ثابت بھی قطعی طور پر ہے، اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان "إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ" کہ یہ قطعی الدلالۃ نہیں ہے کیونکہ اس جملے کے بغیر (یعنی اس جملے کے علاوہ) کوئی اور جملہ ہو ہی نہیں سکتا اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے اتنی وضاحت کے ساتھ۔

قطعی طور پر اگر کوئی شخص اس بات کو ثابت کرنا چاہتا ہے تو اس جملے سے بڑھ کر کوئی جملہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر حدیث میں ہوتا ''إنكم ترون ربكم'' تو تاویل ممکن ہوتی کہ علم یقینی کی جو ہے وہ دیکھنے کے تعلق سے بات کی ہے، لیکن جب عنقریب ''سَتَرَوْنَ''؛ اور پھر چاند کی مثال بھی دی ہے ایک حسّی چیز کی جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پھر تو معنی جو ہے وہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ اہل التعطیل جو ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے منکر ہیں وہ ان احادیث کی تاویل (یعنی تاویل کے نام پر حق بات تو یہ ہے کہ تحریف ہی کرتے ہیں) کرتے ہیں اور رؤیت کی علم سے تفسیر کرتے ہیں کہ رؤیت سے مراد علم ہے کہ جان لیتے ہیں "مومن ربّ کا دیدار نہیں کریں گے بلکہ جان لیں گے"۔ کیا جانیں گے ؟! کیا وہ جانتے نہیں کہ اُن کا ربّ ہے ؟! دیکھیں نا (سبحان اللہ) وہ کون سا مزید علم ہو گا جو پہلے نہیں جانتے تھے ؟!

کیا (نعوذ باللہ) ربّ کو پہلے نہیں جانتے تھے اب جنت میں داخل ہو کر جانیں گے ربّ کو ؟!

لیکن (سبحان اللہ) ایک بدعقیدگی دل میں بیٹھ گئی ہے اب اس کو تو انہوں نے ڈیفنڈ (Defend) کرنا ہے اس کا دفاع کرنا ہے کسی طریقے سے، یعنی نہ نقل ہے اور نہ عقل ہے دونوں سے بیچارے کورے ہو گئے !

اور شیخ صاحب فرماتے ہیں: ''وسبق بطلان قولهم'' (اور اس قول کا بطلان ہم پہلے بیان کر چکے ہیں)۔

پھر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''إلى أمثال هذه الأحاديث'' ان احادیث کے علاوہ بھی اور احادیث موجود ہیں؛ (یعنی جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ثبوت ہمیں ملتا ہے))؛ کہ بہت ساری ایسی احادیث ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ربّ کے تعلق سے ہمیں خبر دیتے ہیں جو ان احادیث کی طرح قطعی ہیں دلالت کے اعتبار سے اور ثبوت کے اعتبار سے بھی، اور ان احادیث کا حکم بھی ان احادیث جیسا ہے۔

اور ''الفرقة الناجية'': ''الفرقة'' (گروہ کو کہتے ہیں) ''الناجية'' (جو نجات پانے والے ہیں، دنیا میں بدعت سے نجات پا چکے ہیں اور آخرت میں جہنم کے عذاب سے اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نجات پا چکے ہیں) ''أهل السنة والجماعة'' (یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سنت کو لازم پکڑا ہے اور اس پر جمع ہو گئے ہیں (اہل السنۃ والجماعۃ کون ہیں؟ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سنت کو لازم پکڑا ہے اور اس پر جمع ہوئے ہیں ان کا اجتماع سنت پر ہوا ہے))۔

"يؤمنون بذلك"(ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں)؛یعنی جو بھی خبر اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے اپنے ربّ کے تعلق سے ان تمام پر ان کا ایمان ہے(کس کا ایمان ہے؟اہل سنت والجماعت کا)۔

یہ کون ہیں؟"الفرقة الناجية، الطائفة المنصورة"۔کتنے پیارے الفاظ ہیں(سبحان اللہ)!

"كما يؤمنون بما أخبر الله به في كتابه"(بالکل ایسے ہی ایمان رکھتے ہیں ان احادیث پر جیسے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب(یعنی قرآن مجید)پر ایمان رکھتے ہیں جو بھی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے)۔

کیونکہ(شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں)جو بھی خبر ہمیں اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم اس پر ایمان لے آئیں جیسا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں جو بھی اُس میں خبریں موجود ہیں لیکن جو فرق ہمیں نظر آتا ہے قرآن اور حدیث کے تعلق سے یا جو سنت میں ہمیں ملا ہے جو خبر ملی ہے وہ یہ دو چیزیں ہیں جب ہم سنت کی بات کرتے ہیں:

(۱)توسب سے پہلے ہم سنت کے تعلق سے یہ دیکھتے ہیں کہ ثابت ہے کہ نہیں۔قرآن مجید تو ثابت ہے متواتر ہے حق ہے لیکن جب سنت کی بات ہم کرتے ہیں احادیث کی ہم بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھتے ہیں صحیح ہے کہ نہیں ہے ،ثابت ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یا نہیں۔

(۲)اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب ثابت ہے تو کیا اس حدیث میں یہ دلالت ہے جس کی ہم بات کر رہے ہیں، یا جس موضوع کے تعلق سے اس حدیث کو بطور ثبوت پیش کیا جارہا ہے کیا اس موضوع کی دلالت موجود ہے اس حدیث میں کہ نہیں۔

تو یہ دو چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے جب ہم سنت کا حدیث کی بات کرتے ہیں، لیکن جب ہم قرآن مجید کی بات کرتے ہیں تو صرف ایک چیز کو دیکھنا پڑتا ہے اور وہ دلالت کو دیکھنا پڑتا ہے؛ثبوت تو ثابت ہے لیکن کیا یہ آیت اس موضوع کے لیے دلیل بن سکتی ہے کہ نہیں۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں:اور پہلے بھی ہم بیان کر چکے ہیں وہ دلائل جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر کو قبول کرنے کے وجوب کا بیان ہے اُس میں کئی دلائل ہیں سب پہلے بیان کر چکے ہیں(یعنی اس کتاب کے شروع میں ہی)۔

"من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل": ان چار شرطوں کے ساتھ اہل سنت والجماعت جو ہیں (الطائفة المنصورة ، الفرقة الناجية جو ہیں) جب احادیث پر ایمان رکھتے ہیں اُن احادیث پر جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی ہمیں خبر دی ہے تو ان چار شرطوں کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں: (۱) بغیر تحریف کے۔ (۲) بغیر تعطیل (یعنی بغیر انکار) کرنے کے۔ (۳) اور بغیر کیفیت بیان کرنے کے۔ (۴) اور بغیر تمثیل (یعنی بغیر مثلیت) بیان کرنے کے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: "سبق شرح هذا": یہ بھی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس کی شرح کر چکے ہیں۔

((واللہ أعلم))۔

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ

یہ رسالہ ڈاکٹر مرتضی بن بخش (حفظہ اللہ) کے آڈیو درس (069.العقيدة الواسطية) سے لیا گیا ہے۔ سبق لسانی اور تعبیر کی غلطی کو درست کر دیا گیا ہے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر کوئی اور غلطی نظر آئے تو ضرور آگاہ کریں اور اس خیر کے کام میں شامل ہو جائیں۔